داعی، امام اور قائد

ڈاکٹر غازی صلاح الدین°

اگر یہ سوال پوچھا جائے کہ کیا امام حسن البنا کی زندگی کسی غیر مسلم کے لیے بھی قابلِ تقلید ہوسکتی ہے، تو بلا جھجک میرا جواب ہوگا: 'ہاں'۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس سوال کو غیر حقیقت پسندانہ قرار دیں، لیکن دراصل یہ اس مشترک انسانی رشتے کی قیمت کو نمایاں تر کرنے کی ایک کوشش ہے، جو امام شہید حاصل کرنا چاہتے تھے اور یہی ان کی کامیابی ہے۔

امام البنا شہید ہر لحاظ سے ایک کامیاب شخص تھے۔ اسی لیے ان کے دشمنوں کو قتل کے سوا ان سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ امام شہید کی سیرت مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے لیے ایک پُرکشش اور قابلِ تقلید نمونہ تھی۔

بہت سے بڑے لوگوں کی مانند میدان دعوت میں ان کی عملی زندگی بھی نہایت مختصر تھی، تقریباً ۲۰ برس۔ ابھی عمر کے ۴۲ ویں برس میں تھے کہ مہلت زندگی ختم ہوگئی۔ اس کے باوجود جب وہ اپنی زندگی کا مشن مکمل کر کے خالق حقیقی سے ملے تو ان کے افکار اور دعوت دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ آپ کی دعوت کا پھیلاؤ آج بھی مسلسل جاری ہے اور واقعات عالم کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کر رہا ہے۔

امام نے کامیابی کے اس سفر میں جن صفات سے مدد لی ان میں سے ایک ہر دل عزیزی تھی۔ وہ اپنے افکار و اقوال میں عام فہم اسلوب اور دل نشین اختیار کرتے تھے۔ ایسے کلمات جو سننے

° مشیر صدر جمہوریہ سوڈان۔ ترجمہ: حافظ محمد عبداللہ

والے کے دل میں براہ راست اتر جائیں، جن میں نہ تو کوئی تصنع ہوتا اور نہ تکلف۔ وہ اپنے خطاب کا رخ عامۃ المسلمین اور مسلمانوں کے سواد اعظم کی طرف رکھتے، کبھی اسے مقتدر اور باوسائل طبقے تک محدود نہ رکھتے۔ اگرچہ یہ طبقۂ خواص بھی دعوت کا بلا استثنا مخاطب تھا، لیکن امام اپنی قائدانہ فراست سے بھانپ گئے تھے کہ خیر اور برکت، سواد اعظم کو مخاطب کرنے میں ہے۔ آپ نے عوام سے ربط و تعلق بڑھایا اور عوام کے دل آپ کی ذات سے وابستہ ہو کر رہ گئے۔

امام اپنے مقاصد اور اہداف کی تکمیل کے لیے مسلسل محنت کرتے، جو ایک بے مثل قائد کی صفت ہوا کرتی ہے۔ انھوں نے جب دعوت کا آغاز کیا تو بظاہر دعوت کے پھیلاؤ اور مقبولیت کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سارے اشارے منفی ہی تھے۔ اگر کسی عام آدمی کو وہ مشکل حالات پیش آتے جن کا سامنا امام کو تھا، تو شاید وہ اپنی قسمت کو کوستے ہوئے' اپنے خواب اور امیدیں دل میں لیے اس سارے کام کو لپیٹ چکا ہوتا۔

امام شہید ایک ایسے منبع سے سیراب ہوئے تھے جس کی وسعت لامحدود ہے۔ آپ اس منبع کی اساس کو پا چکے تھے اور آپ کا ایمان تھا کہ اسی مرکز ایمان و حرارت سے آنے والی مدد لامحدود ہے۔ ہر طرح کی مشکلات کے علی الرغم آپ اپنے سامعین تک پیغام پہنچانے اور اسے ان کے دلوں میں اتارنے میں کامیاب ہوگئے۔ آپ مستقل مزاج بھی تھے اور مدبر بھی، اسی لیے بخوبی جانتے تھے کہ اپنے اوقات کو کیسے منظم کرنا ہے اور ترجیحات کو کیسے ترتیب دینا ہے۔ اس راز کو پانا بھی کامیاب ذہن اور کامیاب لوگوں کے امتیازات میں سے ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ شہید نہایت کم سوتے (قلیل النوم) تھے، اور اپنا زیادہ تر وقت فرائض کی ادایگی، بڑے اور اہم دعوتی امور کی تکمیل میں صرف کیا کرتے۔ اگرچہ جماعتی ذمہ داریاں اور پھر اہل خانہ اور عزیز و اقارب کا بھی خیال رکھتے تھے، تاہم بیش تر وقت دعوت کے لیے وقف تھا۔

عظیم قائدین کی مانند ان کے پاس بھی اپنی ذات کے لیے علیحدہ سے کوئی ایسا وقت نہیں تھا کہ جسے دعوتی امور اور لوگوں کا ہجوم مکدر نہ کر دیتا ہو۔ ان کے ہاں نہ تو چھٹی کا تصور تھا اور نہ راحت و آرام ہی کا' بلکہ ان کی زندگی مسلسل کام اور پیہم جدوجہد سے عبارت رہی۔

وہ پورے مصر کا دورہ کرتے اور جگہ جگہ خطاب کرتے رہے۔ اپنے منہج اور اپنے افکار کو

قلم بند بھی کیا اور اپنے ساتھ چلنے والوں کی بڑھتی وپھیلتی تعداد کو منظم بھی کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنی دعوت کو مصر سے باہر عالم اسلام بالخصوص عرب ممالک میں پھیلانا شروع کیا۔ ان کی دعوت کا اصل جوہر یہ تھا کہ دین ایک مکمل نظام حیات ہے۔ زندگی کا کوئی رخ اور میدان ایسا نہیں ہے، جس کے بارے میں اس میں ہدایات نہ ملتی ہوں۔

جب یہود اور مسلمانوں کے درمیان جنگ چھڑی، اور انگریزوں نے مملکت اسرائیل کے قیام کا فیصلہ کیا تو آپ نے دادِ شجاعت دینے کے لیے اخوان المسلمون کے رضا کار مجاہد دستے فلسطین روانہ کیے، اور اس طرح گذشتہ صدیوں کی ذلت وپستی کے باعث بھولے ہوئے فریضۂ جہاد کے احیا کا کارنامہ سرانجام دیا۔ تاریخ مصر کے ان عشروں پر نظر رکھنے والا ہر مصنف فرد بخوبی جان سکتا ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں اور اوپر تلے بننے والی متعدد حکومتیں مسائل اور معاملات کو روایتی طریقے سے دیکھ رہی تھیں۔ کسی کے پاس بھی اپنے طریقے کی سچائی اور منشور کی درستی کا امام جیسا یقین اور اعتماد نہیں تھا۔

اپنی اس صفت کے لحاظ سے امام اپنے ہم عصر قائدین میں فائق تر بلکہ بے مثال تھے۔ امام حسن البنا شہید کے زمانے میں مصر میں بڑے معروف خطبا موجود تھے جو کلام کریں تو لوگ خاموشی سے سنیں اور اشارہ کریں تو لوگ متوجہ ہوجائیں۔ امام حسن البنا کی خطابت میں ان کی سی سحر آفرینی تو نہ تھی، لیکن آپ کے کہے ہوئے کلمات ان کے کلمات سے زیادہ سچے اور زیادہ اثر آفرین ثابت ہوا کرتے تھے۔ عام خطبا میں سے شاید ہی کوئی مقرر مجمع عام سے اتنا قریب تر ہوتا ہو اور کوئی مجمع کسی مقرر سے شاید ہی اس قدر متاثر ہوتا ہو جتنا امام سے ہوتا۔ ان کے اور عام خطبا کے درمیان فرق یہ تھا کہ آپ کے گفتار کی گواہی آپ کا کردار دے رہا ہوتا تھا۔

پھر اس میں تعجب ہی کیا تھا کہ حکومت ان سے تنگ پڑ گئی اور ہر ناپاک ہتھکنڈا آزمانے پر تل گئی۔ انھیں قاہرہ بدر کر دیا گیا۔ یوں سامراجی حکمرانوں نے تو چاہا تھا کہ اس سے امام کی آواز دب جائے گی اور آپ کا اثر کمزور پڑ جائے گا لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ ان کی دعوت میں مزید وسعت آ گئی اور ان کی صدا کا اثر ونفوذ بڑھتا چلا گیا۔

آپ نے زندگی بھر کبھی مغربی علوم نہیں پڑھے، نہ معاصر یورپی ثقافتی ادب کی طلب کبھی

آپ کے دل میں پیدا ہوئی۔ آپ کی رسمی تعلیم و تربیت دارالعلوم قاہرہ میں علوم شرعیہ تک محدود تھی۔ لیکن اپنی فطری ذکاوت اور تاریخ کے گہرے ادراک نے انھیں مغربی تہذیب اور منہ زور جدیدیت کے چیلنج کا گہرا فہم عطا کر دیا تھا۔

امام حسن البنا نے مادی تہذیب کے چیلنج کے جواب میں ایک مکمل منصوبۂ عمل پیش کیا۔ آپ کی سادہ سی فکر کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین سے رہنمائی حاصل کریں اور شریعت کو اپنے تمام معاملات میں حاکم بنائیں۔ جسے شریعت مباح قرار دے، اسے لے لیں۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ تہذیب جدید سرتاپا شر ہے اور انسانی دانش کا تمام ورثہ سراسر جھوٹ ہے، نہیں بلکہ مطالبہ صرف یہ رہا کہ اسلام ہی مسلمانوں کے معاملات میں بالادست ہو اور ان کی پسند و ناپسند کا مرکز بھی عملاً وہی ہو۔ وہ مسلمانوں کو ان کا وہ عقیدہ یاد دلاتے تھے جسے طویل دور انحطاط نے ان کے ذہنوں سے محو کر رکھا تھا اور مغرب کی ثقافتی یلغار جسے دور کہیں دفن کر چکی تھی: یہ کہ بندے کی زندگی کا ہر لمحہ عبادت ہے۔ دین کو زندگی کے کسی بھی حصے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ امام ہمیشہ فرمایا کرتے تھے: ''اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی، یہ کتاب (ہدایت) بھی ہے اور تلوار بھی۔''

امام البنا کے ان الفاظ نے مسلمانوں کے دل میں موجود اس آتش فشاں کو بھڑکا دیا تھا، جسے وقتی طور پر دنیا کی محبت اور پست و ذلیل فطرت نے دبا رکھا تھا۔ یہ وہ مسکت جواب تھا جو شیخ نے تہذیب جدید کے چیلنج کا دیا۔ یہ تہذیب پوری دنیا کو بالعموم اپنا تابع فرمان بنانے کے لیے صدیوں تک لڑائی لڑتی رہی، اور مسلمانوں کو بالخصوص اپنے نوآبادیاتی حملوں، اور پے در پے ثقافتی یلغار کے ذریعے سے اپنے مفادات کے سامنے جھکانے کی کوششیں کرتی رہی۔

امام شہید نے اپنے علاقے کے عام باشندوں کی طرح ایک صوفیانہ فضا سے معمور گھرانے میں پرورش پائی۔ ذکر و اذکار کی آوازوں نے آپ کی سوچ و فکر کو سنوارا، اور راتوں کی عبادت نے آپ کے کردار کو صیقل کیا تھا۔ آپ مزاجاً نرم خو اور فطرتاً متدین تھے۔ دیکھنے والے کو آپ کی آنکھوں میں حیا اور چہرے پر نور ایمان کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ ہمیں امام شہید کی زیارت کا موقع نہیں ملا، لیکن جب ان کی تصویر دیکھتے ہیں تو جذبات سے عاری عام تصاویر کے برعکس حسن و جمال اور زندگی کے ہر رنگ سے بھرپور نظر آتی ہے۔

مدرسۂ حیات نے انھیں سکھایا تھا کہ امت کے اندر رائج الوقت دین داری کے سارے اسلوب ان کے اس سوال کا شافی جواب دینے سے قاصر ہیں کہ احیاے ملت اسلامیہ کیسے ممکن ہے۔ جس صوفیانہ پس منظر نے آپ کے مزاج اور آپ کی فکر و اسلوب کو تشکیل دیا تھا، اس نے آپ کے سامنے دین کا اصل راستہ واضح کر دیا اور آپ نے زندگی کے دیگر پہلوؤں کو چھوڑ کر دین کو چند رو و اذکار اور قلبی اعمال تک محدود کرنا گوارا نہ کیا۔ آپ کہا کرتے تھے کہ میرا عقیدہ شرک اور کجی سے پاک ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے اپنی دعوت کو مجرد نظریات اور کلامی مسائل تک محدود نہ رکھا تھا کہ جن کا زندگی کے نئے پیش آمدہ مسائل سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ آپ کی ذات میں بادشاہ وقت نے اپنی نام نہاد حکمرانی کے جواز کو عظیم خطرہ محسوس ہوا۔ پھر خطرے کا یہ شعور ایوان حکومت اور اس کے کارپردازوں سے نکل کر مصر اور مصر کی دیگر سیاسی قوتوں تک سرایت کر گیا جو امام کی بقا میں اپنا زوال دیکھتی تھیں، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ حسن البنا کا پروگرام خالصتاً اصلاحی نوعیت کا تھا۔ آپ نے کبھی کسی کے استیصال کا نعرہ بلند نہیں کیا، بلکہ عملاً قائم شدہ نظام کی اصلاح کی طرف ہی بلایا۔ لیکن آپ کی دعوت کی قوت و تاثیر کو دیکھ کر دوسرے آپ کے استیصال پر تل گئے۔ آپ کی زندگی کے خلاف سازش کی گئی اور بالآخر شہادت آپ کا مقدر ٹھیری۔

دشمن آپ کی ذات کے ساتھ وابستہ فضل کو نہیں پا سکے۔ یقیناً امام حسن البنا جیسے آدمی کے لیے بہترین خاتمہ شہادت ہی ہو سکتا تھا۔ اول تو اس لیے کہ شہادت آپ کی اور آپ کے دیگر ساتھیوں کی قلبی تمنا تھی۔ یہی تو تھے جنھوں نے فلسطین میں کار جہاد کی تجدید کا کارنامہ انجام دیا تھا۔ شہادت سے بڑھ کر اور اس سے قوی تر کوئی اور گواہی ہو نہیں سکتی جسے آدمی اپنے صدق و اخلاص پر دے سکے۔ آج امام البنا کی شہادت کو تقریباً ۶۰ برس ہو گئے ہیں لیکن امام کے افکار و نظریات عامۃ المسلمین، تعلیم یافتہ لوگوں اور ہر درجے کے قائدین کے افکار و نظریات میں ڈھل چکے ہیں۔

❊❊❊